قرآن کریم میں سجع اور فواصل کا تناسب

(۲)

شیخ عبدالرحمن تاج

ترجمہ: محمد راشد اصلاحی

قرآن کریم میں فواصل کا تناسب اور اس کی مختلف قسمیں

قرآن کریم میں فواصل کے تناسب کی متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سے چند خاص خاص یہ ہیں:

۱۔ کبھی یہ تناسب کسی جملے میں بغیر کچھ کمی یا زیادتی کئے ہوئے صرف اس کے کسی کلمہ کو مقدم یا مؤخر کر دینے سے پورا ہو جاتا ہے۔ تقدیم یا تاخیر دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے سے مطلوبہ تناسب حاصل ہو جاتا ہے اس لئے اس کو دوسری صورت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے" قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يَا مُوسٰى (سورۃ طٰہٰ: ۴۹) جہاں تک آیت کے اصل مفہوم کو ادا کرنے کا مسئلہ ہے تو وہ اس طرح بھی پورا ہو سکتا ہے: (قَالَ يَا مُوسٰى فَمَنْ رَّبُّكُمَا) جیسا کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے" قَالَ يَا مُوسٰى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ" (قصص: ۱۹) لیکن اصل مفہوم کی ادائیگی میں دونوں ترتیب کے برابر ہونے کے باوجود آیت کریمہ میں یہ صورت اس وجہ سے اختیار کی گئی کہ فواصل کا مطلوبہ تناسب یہاں اسی طرح پورا ہو سکتا تھا۔ اس کی مثال باری تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے" وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا" (الشمس: ۷-۸) بلاشبہ ارشاد باری" فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا" کو اصل معنی و مفہوم ادا کرنے کے لئے اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے:

"فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا" لیکن آیت کریمہ کی اس ترتیب کو اس وجہ سے ترجیح دی گئی کہ آیت میں جو تناسب مقصود تھا وہ اسی طرح پورا ہو رہا تھا۔ اسی آیت کے متعلق جلال الدین سیوطی کہتے ہیں "یہاں آیت کے فواصل کی رعایت میں تقویٰ کو مؤخر کیا گیا ہے" اسی قبیل میں باری تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ "وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوسٰى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا" (مریم: ۵۱)، "وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا" (مریم: ۵۴) حالانکہ رسالت نبوت سے خاص ہے۔ اور کلام مرسل جس میں عام اور خاص دونوں جمع ہوں اس میں عام کو خاص سے پہلے لایا جاتا ہے لیکن ان دونوں آیتوں میں فواصل کے تناسب کی رعایت کرتے ہوئے خاص کو عام پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ سورہ الف کے ساتھ یا مشدد کے فواصل پر مبنی ہے۔ جیسے سَوِيًّا۔ مَلِيًّا۔ حَفِيًّا۔ عَلِيًّا نَجِيًّا وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ تناسب کی دوسری شکل یہ ہے کہ کسی ایسے جزء کو حذف کر کے اختصار کرنے سے ظہور پذیر ہوتا ہے جو سیاق کلام سے واضح ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: "قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى" (طٰہٰ: ۵۰) چنانچہ عدم حذف کی صورت میں اصل عبارت یوں ہوگی۔ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدَاهُ "لیکن آیت کی موجودہ ترتیب میں مفہوم بالکل واضح ہے اور چونکہ اس سے تناسب کے تقاضے بھی پورے ہو رہے تھے اس لئے اسے ترجیح دی گئی۔ مثال کے طور پر ارشاد باری کو لیجئے "وَالضُّحٰى وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى" اور یہ ارشاد "اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى" (والضحیٰ: ۶-۸) حذف کے بغیر آیت کی صورت اس طرح ہوتی: "مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝" لیکن چونکہ اس کے ذکر اور حذف دونوں صورتوں میں اصل مفہوم بالکل واضح تھا اس لیے فواصل کے تناسب کا مقصد حاصل کرنے کے لئے مفعول کو حذف کر دیا گیا۔

۳- فواصل کی تیسری صورت یہ ہے کہ کسی لفظ کے دو صیغوں میں سے ایک کو ترجیح دی جائے جب کہ معنی اور مفہوم کی ادائیگی میں دونوں صیغے برابر ہوں۔ جیسا کہ ارشاد ہے: "مُهْطِعِينَ إِلَى الدَّاعِ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ" (قمر:۸) یہاں "هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ" کے بجائے "يَوْمٌ عَسِيرٌ" بھی کہا جا سکتا تھا کیونکہ دونوں الفاظ کے معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اور یہ کئی دوسری آیات میں استعمال بھی ہوا ہے۔ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ" (مدثر: ۹-۱۰) کیونکہ یہاں فواصل کے درمیان تناسب اسی صیغے سے پورا ہو رہا تھا۔ نیز ارشاد ہے: "وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكَافِرِينَ عَسِيرًا" (فرقان: ۲۶) اس سورۃ میں بھی فواصل کے درمیان جو تناسب مطلوب ہے وہ اسی لفظ کا متقاضی تھا۔ اسی طرح آیت: "وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" (مزمل:۸) میں "تَبْتِيلًا" کو "تَبَتُّلًا" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس ترجیح کا سبب یہ ہے کہ اس سے فواصل کی مناسبت پوری ہو رہی تھی۔ علامہ زمخشری کشاف میں اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں: "وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ" کا مطلب ہے "وانقطع إليه"، پھر کہتے ہیں۔ اگر تم یہ کہو کہ "تَبَتُّلًا" کی جگہ "تَبْتِيلًا" کیوں لایا گیا تو میں کہوں گا کہ "تبتل" کے معنی نفس کو دنیا سے کاٹ کر خدا کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ چنانچہ فواصل کی رعایت کرتے ہوئے "تَبْتِيلًا" کو اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: "كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَازْدُجِرَ" (قمر: ۹) بھی اسی قبیل سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں فواصل میں تناسب پیدا کرنے کے لیے صیغے کو بدل دیا گیا ہے۔ ان کی توجیہ کے مطابق آیت کا مفہوم یوں ہے کہ "نوح علیہ السلام کی قوم نے ان کی تکذیب کی۔ انھیں دیوانہ اور خبطی کہا اور انھیں جھڑک دیا یعنی ان کی اہانت کی، انھیں برا بھلا کہا اور دھمکیاں دیں" لیکن آیت میں مجہول کا صیغہ "اُزْدُجِرَ" لایا گیا ہے کیونکہ اس سے تناسب کے حصول کے ساتھ ساتھ موقع و محل واضح طور پر مخفی فاعل کی نشاندہی بھی کر رہا ہے لیکن صرف اس مفہوم پر آیت کو محمول کرنا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح اور راجح بات

یہ ہے کہ ازدجار قوم کوح کا فعل نہیں تھا جنھوں نے ان کی تکذیب کی اور ان کا انکار کیا بلکہ یہ تو وہ معاملہ ہے جو جن مجنون کے ساتھ کرتے ہیں۔ کیونکہ نوح علیہ السلام کی قوم نے ان پر شدید جنون کا الزام لگایا اور کہا کہ وہ خطبی ہیں اور جنون نے ان کو حواس باختہ کر دیا ہے اور ان کی عقل زائل کر دی ہے۔ بلاشبہ یہ مفہوم فی نفسہ ان علمائے کے قول سے زیادہ صحیح ہے کیونکہ دیوانگی، اضطرابِ نفس اور اختلالِ عقل یہ وہ افعال ہیں جو شیطانؑ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ جیساکہ ارشاد باری ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰا	جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں
لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ	اٹھیں گے مگر اس شخص کی طرح جس کو
یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ	شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔

(البقر:- ۲۷۰)

نہ صرف یہ کہ یہ مفہوم فی نفسہ زیادہ بہتر ہے بلکہ اس مفہوم کی پوری وضاحت کے لئے مفعول کا صیغہ "اُزْدُجِرَ" ہی مناسب تھا۔ پھر اسی صیغے سے فواصل کی مناسبت بھی پوری ہو رہی تھی۔ چنانچہ یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس تناسب کے حصول کے لئے صیغہ کو مجہول کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ صیغہ اپنے موقع و محل کے لحاظ سے بالکل صحیح جگہ استعمال ہوا ہے اور مجہول ہونے کی صورت میں اس کا مفہوم بالکل واضح ہے اور "رَجُلٌ ممسُوسٌ۔ وَرَجُلٌ مصرُوعٌ وَمَخبُولٌ"، جیسی تراکیب تو بالکل عام ہیں۔ ان سب کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ شیطان نے اس کو مس کر دیا ہے اس کی عقل کو زائل کر دیا ہے اور اس کو حواس باختہ کر دیا ہے۔ چنانچہ جب اس آیت میں مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ، کہا گیا تو اس کا مفہوم یہ ہوا کہ شیطان نے اس کی عقل اڑا دی ہے اور اس کو خطبی بنا دیا ہے۔ اس میں فاعل کی تصریح کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ معلوم اور متعین ہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن الفاظ کی آرائش و زیبائش سے زیادہ معنی اور مفہوم کو واضح اور مستحکم کرنے کی طرف توجہ دیتا ہے اور یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن فواصل کے تناسب کے لئے کوئی ایسا لفظ استعمال کرتا ہے جس کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ معنی اور

اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ" سے "اَصَدَقْتَ اَمْ كَذِبْتَ" مراد لیا ہے مگر "كُنْتَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ" اس کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ اگر اس کا شمار جھوٹوں میں ہوتا ہے تو پھر وہ جھوٹا ہوگا بھی۔ چنانچہ اس صورت میں وہ جو بھی اطلاع دے گا اسے جھوٹ ہی سمجھا جائے گا اور اس پر بھروسہ نہیں کیا جائے گا۔

آیت کریمہ: "اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ" (شعراء: ۴) بھی ان آیات میں شامل ہے جن میں مفہوم مراد کے ظاہری تقاضوں سے صرف نظر کیا گیا ہے لیکن ایسا سجع اور فواصل کی رعایت میں نہیں کیا گیا بلکہ اس سے زیادہ بلیغ اور موثر معنوی تعبیر کو اختیار کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ اگر یہاں "اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلُّوْا لَهَا خَاضِعِيْنَ" کہا گیا ہوتا تو اس تعبیر میں کسی سوال اور جواب کی گنجائش نہ رہتی۔ لیکن آیت کے وسط میں لفظ اعناق لایا گیا ہے اور خضوع کی نسبت اسی کی طرف کی گئی ہے اور وہ اس لئے کہ خضوع کے ساتھ جو آثار و مظاہر مخصوص ہیں ان کا اظہار عموماً گردن ہی سے ہوتا ہے جیسے گردن کا جھکانا بالکل اسی طرح جس طرح خوشی انبساط اور قوت کا اظہار گردن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا: "وسالت باعناق المطی الأباطح"، لیکن یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر صورت حال یہ ہے تو پھر "فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعَةً" کیوں نہ کہا گیا۔ جب کہ بظاہر یہی ہونا چاہیئے۔ اس کے بجائے "خاضعین" کا صیغہ سجع اور فواصل کی رعایت میں تو نہیں استعمال کیا گیا ہے؟ چنانچہ اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن کریم سجع کی رعایت اس حد تک کرتا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایسی تعبیر بھی استعمال کرتا ہے جس سے زیادہ مناسب اور قریب تر تعبیر دستیاب ہو تو ایسا کہنے والا حق بجانب نہیں ہوگا؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ "خَاضِعَةً" کی جگہ "خَاضِعِيْنَ" کی ترجیح جو کہ عقلا کے لئے بطور جمع استعمال ہوتی ہے صرف سجع کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ اس میں حکمت یہ

مفہوم کے لحاظ سے اس سے زیادہ صحیح اور قریب تر ہو۔ اسی طرح یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ قرآن فواصل میں تناسب کے حصول کے لئے ایسے لفظ کو چھوڑ کر جو معنی اور مفہوم کی ادائیگی میں بالکل واضح اور غیر مبہم ہو کسی غیر واضح اور مبہم لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں معنی و مفہوم کے بالمقابل الفاظ کی رعایت کا پہلو غالب ہوگا۔ جب کہ قرآن کریم کے اسلوب بیان میں اولیت معنی و مفہوم کو حاصل ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات کا اسلوب اس استدلال سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر باری تعالیٰ کا یہ ارشاد "وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ" (قمر: ۱۳) ظاہر ہے اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام پر احسان کیا۔ چنانچہ ان کو "سفینہ" پر سوار کر کے غرق ہونے سے بچا لیا اور طوفان سے نجات دی۔ پھر اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ لفظ سفینہ ہی اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے واضح اور معروف ہے اور یہ لفظ اسی معنی کو ادا کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ قرآن نے بھی اس لفظ کو اسی مفہوم میں خود حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "فَأَنجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ" (عنکبوت: ۱۵) اسی طرح لفظ "فُلک" بھی لغت میں اسی معنی کے لئے وضع کیا گیا ہے اور اسی معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہ لفظ متعدد مقامات پر حضرت نوح علیہ السلام ہی کے قصے میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے: "وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ" (ھود: ۳۷) "وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ" (ھود: ۳۸) "فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (مومنون: ۲۷) اور "فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنتَ وَمَن مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي نَجَّانَا مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (مومنون: ۲۸) اور پھر یہ بھی ہے کہ "سفینہ اور فلک" دونوں ایک ہی لفظ پر مشتمل ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ اپنے معنی کی ادائیگی میں "ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ" کی سہ لفظی ترکیب سے زیادہ واضح اور مختصر ہیں۔

چنانچہ ایک متعین، واضح اور معروف لفظ کے بجائے ایک تین لفظوں والی ترکیب کو استعمال کرنے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہاں لفظ کی رعایت کو معنی پر ترجیح دی گئی ہے اور اس سے محض فواصل میں تناسب مقصود ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے بارے میں یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ اس میں معنی اور مفہوم کے بجائے الفاظ پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور اس نے معنیٔ مراد کی تعبیر کے لئے ایک واضح لفظ کے بجائے تین الفاظ پر مشتمل صفت اختیار کی ہے اور ایسا محض فواصل میں لفظی تناسب اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کیا ہے۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ اگر قرآن کریم نے تین الفاظ والے مرکب کو اختیار کیا ہے تو اس سے ایک ایسی معنوی جہت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جس کو حضرت نوح علیہ السلام پر اللہ کے فضل و کرم اور کشتی بنانے میں ان کی رہنمائی کے احسان کے سلسلہ میں مد نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہی ان کی اور ان کی قوم کے صاحبِ ایمان لوگوں کی اس طوفانِ عظیم سے نجات کا واحد ذریعہ تھی جو چاروں طرف پھیل گیا تھا اور پوری کی پوری قوم کو تہس نہس کر دیا۔ چنانچہ ارشاد باری: "وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ" کی تعبیر کو اس وجہ سے نہیں اختیار کیا گیا کہ اس سے فواصل کا تناسب پورا ہو۔ بلکہ اس تعبیر میں ایک اہم معنوی فائدہ مضمر ہے اور مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ کے رسول نوح علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی طوفان کی تباہ کاری سے نجات، اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی عظیم عنایت کی مظہر تھی۔ جب اس نے انھیں میخوں سے جڑے ہوئے لکڑی کے چند تختوں پر سوار کیا جو انتہائی کمزور تھے اور ان میں خود اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس طوفان کی سرکش لہروں کا سامنا کر سکتے اور اس کی شدت و ہولناکی کے سامنے قائم رہ سکتے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہی تھی کہ اس نے اس ضعف کو قوت میں بدل دیا اور اس معمولی کمزور کشتی کو اس قابل بنا دیا کہ وہ طوفان کی لہروں سے گزر جائے اور اس کی شدت و ہولناکی کو جھیلتی ہوئی حضرت نوح علیہ السلام اور دوسرے مومنین کو امن و عافیت کے ساحل تک

پہنچا دے۔ اس مفہوم کا اظہار لفظ "فلک" اور "سفینۃ" سے ممکن نہیں تھا۔ اس کی مکمل وضاحت اسی طور ممکن تھی جس طرح آیت میں وارد ہے: "وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ الْوَاحٍ وَدُسُرٍ" امام فخر الدین رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: "وَحَمَلْنَاهُ عَلَىٰ ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ" یہاں موصوف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور صفت کو اس کا قائم مقام بنا دیا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کشتی اصل میں میخوں سے جڑے ہوئے کچھ تختوں کا مجموعہ تھی جن کا بکھر جانا حد درجہ آسان تھا لیکن ایسا نہیں ہوا تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام تھا اور اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سفینۃ اور فلک کی تعبیر کے لئے اس تین الفاظ والی ترکیب کو استعمال کرنے کا اصلی مقصد اسی مفہوم کی طرف توجہ دلانا تھا۔ محض فواصل میں تناسب کی رعایت مقصود نہیں تھی۔ فواصل میں تناسب کے حصول کی بھی خاص اہمیت ہے لیکن اس کا مقام و مرتبہ معنی اور مفہوم کے بعد ثانوی درجے میں ہے۔

دوسری آیت

دوسری آیت جس کے سلسلہ میں ہمارے مذکورہ بالا استدلال کے سلسلہ میں کہ قرآن کریم لفظ سے پہلے معنی اور مفہوم پر توجہ دیتا ہے اور محض فواصل کے درمیان تناسب کے حصول کے لئے کسی ایسے لفظ پر جو معنی مراد کی ادائیگی میں زیادہ واضح ہو کسی ایسے لفظ کو ترجیح نہیں دیتا جو معنی مقصود کی ادائیگی میں زیادہ واضح نہ ہو۔ قرآن مجید کی جس آیت کے سلسلہ میں اعتراض وارد کیا جاتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے "فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ (عبس: ۱۲) علامہ زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں ضمیر منصوب اس سے پہلی آیت "كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ" میں لفظ "تَذْكِرَةٌ" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ پھر وہ مونث مرجع کے لئے مذکر ضمیر کے استعمال کو صحیح ثابت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ضمیر یہاں مذکر استعمال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ "تَذْكِرَةٌ" ذکر اور وعظ کے مفہوم میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن نے مؤنث مرجع کیلئے مونث ضمیر سے صرف نظر کرتے ہوئے مذکر ضمیر صرف اسلئے استعمال کی تاکہ ان آیات میں فواصل کی مناسبت پوری ہو جائے

وہ آیات یہ ہیں: "فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۝ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ۝" (عبس ۱۲ تا ۱۸) اسی طرح اور متعدد آیات ہیں جن کے فواصل ان آیات کی مناسبت سے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن معنی اور مفہوم پر الفاظ کو ترجیح دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ معنی اور مفہوم کو اولیت دیتا اور الفاظ کو اس پر ترجیح نہ دیتا تو آیت یوں ہوتی: "كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهَا ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ" مگر ایسی صورت میں فواصل کا مطلوبہ تناسب حاصل نہ ہوتا۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض صرف اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جب علامہ زمخشری کی یہ رائے تسلیم کر لی جائے کہ "فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ" میں ضمیر کا مرجع سابقہ آیت کا لفظ "تذکرۃ" ہے۔ اور یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ اس رائے کو اختیار کیا جائے۔ علامہ جلال الدین المحلی نے "فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ" کی یہ تفسیر بیان کی ہے: "حفظ ذالك فاتعظ بہ" چنانچہ وہ ضمیر کو مذکر مرجع "ذالک" کی طرف راجع بتاتے ہیں۔ اس سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں ضمیر منصوب قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے گو کہ یہاں اس کا ذکر نہیں ہوا ہے لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ذہن میں ہر وقت تازہ ہے۔ آگے جو آیات آ رہی ہیں وہ اسی مفہوم کی تائید کر رہی ہیں۔ "فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝" چنانچہ یہ بات عیاں ہے کہ یہ سب قرآن ہی کی صفات ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ "فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ" میں ضمیر مذکر، مونث کی جگہ نہیں لائی گئی ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ ایسا فواصل میں تناسب پیدا کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

تیسری آیت

اس سلسلہ میں تیسری آیت جو ہمارے استدلال کے معارض سمجھی جاتی ہے، یہ ہے۔ "قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۝" (شعراء: ۱۳۶) یہ اشارہ ہے قوم عاد کی اس گفتگو کی طرف جو انھوں نے اپنے رسول

ہود علیہ السلام کے جواب میں کی تھی۔ جب انھوں نے لوگوں کو تقویٰ اور ایمان باللہ کی نصیحت کی اور باطل معبودوں سے دست کش ہونے کو کہا اور ان کو سرکشی اور کفر وشرک کے انجام بد سے آگاہ کیا اور ان سے کہا۔ "فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝" (شعراء: ۱۳۱ تا ۱۳۵) اس کے جواب میں ان کی قوم نے کہا: "قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ" یعنی یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری ان باتوں کا ہمارے اوپر کوئی اثر ہوگا۔ اور نہ ہی امید کرنا کہ ہم اپنی موجودہ روش کو چھوڑ کر تمہاری پکار پر لبیک کہیں گے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ بات جب مقابلہ کی ہے تو اسے اس طور پر ہونا چاہیئے۔ "قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَعِظْ" اس لئے کہ "اَمْ لَمْ تَعِظْ" نہ صرف یہ کہ مختصر ہے اور بالکل سامنے کی بات نظر آتی ہے بلکہ آیت کریمہ میں مذکورہ عبارت "اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ" سے جو مفہوم مستفاد ہے اس کو بھی بخوبی ادا کرتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کریمہ میں مذکورہ عبارت قدرے طویل بھی ہے اور مفہوم کی تعبیر کے سلسلہ میں اصول کے خلاف جاتی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس تعبیر کو اختیار کرنے کی صرف ایک ہی وجہ نظر آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا فواصل کے درمیان تناسب، کے نقطہ نظر سے کیا گیا ہے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ جو مقابل آیت کریمہ میں وارد ہوا ہے اس سے فواصل میں تناسب کا مقصد حاصل ہو رہا ہے لیکن اس تناسب کے حصول کے لئے ایسا نہیں کیا گیا کہ اصل، مختصر اور مفہوم سے قریب تر لفظ کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں الفاظ کا مفہوم ایک نہیں ہے جیسا کہ غلطی سے گمان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہود علیہ السلام کی قوم نے دعوتِ حق کی قبولیت کے باب میں ان کی امید کو یکسر ختم کر دینا چاہا۔ چنانچہ ان سے کہا: "انہ یستوی عندھم ان یعظھم وان یکون من غیر الواعظین" مطلب یہ کہ ان کے نزدیک

دونوں باتیں برابر ہیں چاہے وہ انھیں نصیحت کریں یا سرے سے نصیحت نہ کرنے والوں میں سے ہو جائیں یعنی سرے سے وعظ کہنے کے اہل ہی نہ رہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مایوس اور ناامید کر دینے کے مقصد سے یہ تعبیر اس مختصر بدل سے کہیں زیادہ موثر اور بلیغ ہے۔ اور اسی معنی کی طرف علامہ زمخشری نے بھی اپنی تفسیر "کشاف" میں توجہ دلائی ہے، وہ کہتے ہیں: "اگر تم یہ کہو کہ اگر "اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَعِظْ" کہا گیا ہوتا تو یہ مختصر ہوتا اور مفہوم بھی ایک ہی ہوتا۔ تو میں کہوں گا کہ دونوں کے معنی ایک نہیں ہیں بلکہ ان کے مفہوم میں خاصا فرق ہے۔ آیت کی مراد یہ ہے کہ ہمارے لئے یکساں ہے خواہ تم وعظ و نصیحت کا عمل کرو یا سرے سے اس سے کوئی واسطہ اور سروکار ہی نہ رکھو۔ چنانچہ اس سے حضرت ہود علیہ السلام کی وعظ و نصیحت سے ان کی انتہائی بے توجہی اور بے التفاتی اس سے کہیں زیادہ واضح اور بلیغ انداز میں ظاہر ہو رہی ہے جتنی کہ "اَمْ لَمْ تَعِظْ" کہنے سے ظاہر ہوتی۔

مذکورہ بالا آیت کے سلسلہ میں جو توجیہ ہم نے پیش کی ہے۔ وہی اس کے مختلف نظائر کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ارشاد باری "قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ" (نمل: ۲۷) کو لیجئے۔ بات چونکہ مقابل کی ہے اس لئے بظاہر اسے یوں کہنا چاہیئے تھا: "قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ لَمْ تَصْدِق یا "صَدَقْتَ اَمْ كَذَبْتَ"۔ لیکن اس سے صرف نظر کر کے یوں کہا گیا جیسا کہ آیتِ کریمہ میں وارد ہوا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ادائیگی معنی میں یہ کہیں زیادہ موثر اور بلیغ ہے۔ کیونکہ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ملکہ سبا کے بارے میں غلط بیانی کی جرات نہیں کر سکتا اِلّا آنکہ جھوٹ اس کی گھٹی میں پڑا ہوتا۔ چنانچہ آیتِ کریمہ: "قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ" میں جو صیغہ استعمال ہوا ہے اس سے یہی مفہوم ادا ہوتا ہے۔ مزید برآں دوسرے درجے میں اس سے فواصل میں تناسب کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ زمخشری لکھتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول: "اَصَدَقْتَ

ہے کہ جب گردن کو خضوع کی صفت سے متصف کیا گیا جو کہ عقلا کے لئے مخصوص ہے تو مناسب معلوم ہوا کہ اس وجہ سے اس پر عقلا کے احکام بھی جاری کئے جائیں چنانچہ اس کے لئے وہی جمع لائی گئی۔ اس پہلو کو ٹھیک اسی طرح اس آیت کریمہ میں مدنظر رکھا گیا ہے: "اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ" (یوسف:۴)

جہاں تک سجع اور فواصل کے تناسب کی رعایت کا معاملہ ہے تو یہ دوسرے درجے میں ہے چنانچہ صرف اسی وجہ سے آیت میں "خَاضِعَةً" کے بجائے "خَاضِعِیْنَ" نہیں کہا گیا ہے۔

نقد و تحلیل

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب "الإتقان" میں شیخ شمس الدین بن الصائغ الحنفی کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "احکام الرای فی احکام الای" میں فواصل کے تناسب کی لگ بھگ چالیس انواع ذکر کی ہیں۔ اور سیوطی نے ان کو اپنی کتاب میں مثالوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ہمارے خیال میں ان میں سے بیشتر صورتیں ایسی ہیں جن کے استعمال کا اصل سبب فواصل میں تناسب پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ اصلاً ان میں معنی اور مفہوم کا لحاظ کیا گیا ہے اور بلاغت کی تقاضوں کی رعایت کی گئی ہے۔ فواصل کے تناسب کا معاملہ اس کے بعد آتا ہے۔

۱۔ پہلی نوع میں انھوں نے جو مثال بیان کی ہے وہ عامل پر معمول کی تقدیم کی مثال ہے۔ جیسے ارشاد باری: "اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ" "وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ"، ان کی توجیہ کے مطابق ان آیاتِ کریمہ میں فواصل میں تناسب پیدا کرنے کے لئے مفعول کو فاعل پر مقدم کر دیا گیا ہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے: "اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ" میں معمول کی تقدیم کا سبب فواصل میں تناسب پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی وجہ معنی کی رعایت ہے اور جو چیز مقدم کی گئی ہے اس کی مہتم بالشان ہونے کی کیفیت کا بیان مطلوب

ہے اور اس امر پر اظہارِ حیرت کہ ملائکہ کی پرستش کی جائے۔ رہا فواصل کے تناسب کا معاملہ تو اس کا مرتبہ اس کے بعد آتا ہے۔

جہاں تک "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کا تعلق ہے تو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں عامل پر معمول کی تقدیم کا سبب اللہ تعالیٰ سے استعانت میں حصر کا مفہوم پیدا کرنا ہے اور ظاہر ہے اس سے مقصود ایک مخصوص معنوی فائدے کا حصول ہے نہ کہ لفظی آرائش وزیبائش۔

۲۔ ان کے بیان کے مطابق پانچوں نوع یہ ہے کہ فواصل کے تناسب کے مقصد سے صفتِ جملہ کو صفتِ مفرد پر مقدم کر دیا جاتا ہے جیسے اس آیت کریمہ میں "وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا" (بنی اسرائیل: ۱۳) ان کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ "مَنْشُوْرًا" کتاب کی صفت ثانیہ ہے اور صفتِ مفرد کے بارے میں اصول یہ ہے کہ یہ صفتِ جملہ پر مقدم ہوا کرتی ہے۔ لیکن فواصل میں تناسب پیدا کرنے کے لئے یہاں اس کو مؤخر کر دیا گیا ہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں اعراب کی دونوں تاویلوں میں سب سے بہتر اور معنی کے لحاظ سے سب سے صحیح یہ ہے کہ "مَنْشُوْرًا" "يَلْقٰىهُ" کی ضمیر منصوب سے حال واقع ہے اور اگر یہ کتاب کی دوسری صفت ہوتی تو اصول کے مطابق اس صورت میں صفتِ جملہ پر مقدم ہوتی۔ چنانچہ ایسی صورت میں تفہیم کے مقصد سے اس طرح کہا جا سکتا تھا: "وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا مَّنْشُوْرًا يَّلْقٰىهُ" لیکن "يَلْقٰىهُ" کو اس طرح کلام کے آخیر میں لانے سے کلام کی ساخت میں پھسپھسا پن پیدا ہو جاتا اور معنی کا زور کم ہو جاتا۔ اور یہ چیز قرآنِ کریم کے شایانِ شان نہیں۔ آیتِ کریمہ میں کلام کی ساخت سے یہ مفہوم ابھر کر سامنے آتا ہے کہ آخرت میں جب انسان کو نامہ اعمال دیا جائے گا تو وہ کھلا ہوا ہوگا، بند نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس میں مندرج اعمال اس کے سامنے ہوں گے اور وہ بلا کسی دقت وزحمت کے ان کو پہچان لے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں بھی اصلاً معنی اور مفہوم کی استواری اور بلاغت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جہاں تک الفاظ کی رعایت کا معاملہ ہے جس کا تعلق فواصل کے تناسب

سے ہے تو یہ اس کے بعد کی بات ہے۔

۳۔ بیسویں نوع کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ فواصل میں تناسب کی رعایت کے مقصد سے تثنیہ کی جگہ مفرد سے بات پوری کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آیتِ کریمہ:

"فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى" (طٰہٰ: ۱۱۷) گو وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہاں اصل میں "فَتَشْقَيَا" تھا۔ لیکن فواصل کے تناسب کے لئے "فَتَشْقٰى" کہا گیا ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں صحیح بات وہ ہے جس کو بیشتر اعلام مفسرین نے بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے قول میں "فَتَشْقٰى" کو مفرد لانا اس بات کی دلیل ہے کہ جنّت سے نکالے جانے کے سبب جو محرومی حصہ میں آئی اس میں اصل حضرت آدم علیہ السلام تھے باقی لوگ ان کی تبعیت میں اس سے دوچار ہوئے۔ انسانی ضروریات معاش کے حصول کی راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ بھی اسی محرومی کا حصہ ہیں اور اس سلسلہ میں بھی اصل مرد ہی ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ اس تفصیل سے آیتِ کریمہ میں اس لفظ کو مفرد لانے کی حکمت واضح ہو جاتی ہے۔ فواصل کے تناسب کے ذریعہ الفاظ کی آرائش و زیبائش کا معاملہ اس کے بعد میں آتا ہے۔

۴۔ انتالیسویں نوع میں فواصل کے تناسب کے سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ کبھی کبھی اس مقصد کے حصول کے لئے ماضی کی جگہ مستقبل کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ارشاد باری ہے: "فَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ" (بقرہ: ۸۷) وہ کہتے ہیں کہ یہاں "تَقْتُلُونَ" دراصل "قَتَلْتُمْ" تھا۔ مقامِ حیرت ہے کہ مؤلف نے اپنی نظر کو اتنے تنگ دائرے تک محدود رکھا اور ان کی بصیرت اس وسیع افق کی طرف متوجہ نہ ہوئی جس میں قرآنِ کریم کے مخصوص اسلوب بیان کی جلوہ سامانیاں اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔ اس آیت کریمہ کے آخر میں مضارع کے صیغے کے استعمال میں ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے جس کا تعلق حقیقتِ واقعہ سے متعلق خبر دینا ہے اور قرآنی اسلوب میں مرادِ مطلوب کا اظہار و توضیح ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہے

کہ ماضی میں یہود سے قتل انبیا جیسے فعل کا صدور رہا ہے۔ پھر ان کی طبیعت کا یہ مزاج جس میں شر پسندی غالب تھی ان کی اولاد میں منتقل ہوا۔ چنانچہ ان میں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے وہ مستقل چالیں چلتے رہتے تھے اور آپؐ کی جان لینے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی شہادت خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جو آپؐ نے مرض الموت میں فرمایا تھا: "خیبر کا لقمہ مجھے برابر تکلیف پہونچاتا رہا یہاں تک کہ وقت آخر آپہنچا"۔

یہود نے ماضی میں انبیا اور رسل کو قتل کیا تھا اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے تھے۔ چنانچہ ایسی عبارت جو ماضی اور پھر مستقبل میں پیش آنے والی دونوں ہی باتوں کی صحیح ترجمانی کرسکے وہ مستقبل ہی کا صیغہ ہوسکتا ہے۔

رہی دوسری بات جو بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس صورتِ حال کو مضارع سے تعبیر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قتل انبیا کے شنیع جرم کے ارتکاب کی تصویر کھنچ جائے تاکہ ان کے بدترین جرائم کا ایک نقشہ سامنے آجائے۔ اور یہ ماضی کے صیغے سے ممکن نہیں۔ اس کے لیے مضارع ہی کا سہارا لینا پڑے گا"۔

ایسے ہی اللہ کا یہ ارشاد بھی ہے: "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً" (الحج: ۶۳) اس کے ذریعہ اس خوبصورت منظر کی تصویر کشی مقصود ہے۔ جب آسمان سے بارش ہونے کے فوراً بعد زمین سبزہ کی روئیدگی سے لہلہا اٹھتی ہے تاکہ لوگوں کے ذہن ودماغ میں اس کا بہترین نقش قائم ہوجائے۔

مذکورہ بالا چار انواع کو ہم نے صرف بطور مثال ذکر کیا ہے۔ ہمارا مقصد "احکام الرای فی احکام الآی" کے مؤلف کی کمیوں کا استقصاء نہیں تھا۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ان امور کے علاوہ بھی ان کی اور بہت سی رائیں خلاف واقعہ ہیں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ